۱۷

اقبال کے کلام میں موضوع اور ہیئت کی ہم آہنگی

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

ایک زمانہ تھا کہ شعر کو نزول وحی سے تعبیر کیا جاتا تھا، لوگ شاعر کو تلمیذ رحمن اور خود شعرا اپنے ''حریر خامہ'' کو ''نوائے سروش'' سمجھتے تھے۔ اسی تصور شعر سے آمد اور آورد کی تفریق پیدا ہوئی تھی اور اچھے اور برے شعر کا امتیازی تجزیہ ناپختہ اور بے رہرو کاوشوں کا باعث بن گیا تھا۔

علم اور فن اور ادب شعوری کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اقبال کے یہاں فنکارانہ شعور کی بڑی فراوانی ہے۔ وہ ایک مفکر بھی ہے اور فنکار بھی۔ اس کے کلام میں عمیق فکر اور دقیق فن کی دل آویز آمیزش ہے اس کا سب سے بڑا کمال یہی نہیں کہ وہ ایک فلسفی ہے اور اس نے دنیا کو نئی حکمت زندگی سے روشناس کرایا ہے بلکہ اس کی عظمت اس میں پوشیدہ ہے کہ وہ حکیمانہ افکار شعر کے حسین اور رنگین پیرائے سے آراستہ کرتا ہے۔ وہ ایک مفکر فنکار ہے ایک عظیم شاعر وہ لاکھ کہے کہ مجھے شاعر نہ کہو، میں غزل گو نہیں۔ 'نہ زبان کوئی غزل کی، نہ غزل سے آشنا میں،

ہر چند کہیں نہیں مگر ہے۔

وہ شعر کے محاسن سے آشنا ہے۔ وہ غزل کی فنی نزاکتوں کو خوب بھانپتا اور سمجھتا ہے۔ اسی چیز کا سرسری تجزیہ ہمارے اس مقالے کا موضوع ہے۔

موضوع سخن سے مراد بنیادی خیال ہی نہیں بلکہ شاعر کا موضوع کی طرف انداز رجحان بھی اس میں شامل ہوتا ہے اس میں شاعر کے مخصوص نقطہ نظر کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے اور اگر وہ نقطہ نظر افادی ہے تو یہ بھی دیکھنا لازمی ہے کہ شاعر کے سامعین کون لوگ ہیں۔

اقبال کی چند ابتدائی غزلوں اور نظموں کو چھوڑ کر اس کے باقی کلام میں یہ عناصر واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ بادی النظر میں ہمیں اقبال کے ہاں کوئی بنیادی لسانی اور عروضی تبدیلیاں نہیں ملتی۔ بظاہر اس نے پرانی اصناف سخن غزل، قصیدہ، مثنوی وغیرہ سے کام لیا ہے اور پرانے اوزان

اور بحریں استعمال کی ھیں ان کا کلام قدیم عروضی نظام میں سمویا ھوا نظر آتا ھے لیکن عروض کا تعلق اوزان سے ھوتا ھے۔ اوزان کا تنوع اور ان کے زحافات، موسیقی کے زیر وبم سے مربوط ھوتے ھیں۔ اسی سے مختلف اصناف سخن وجود میں آتی ھیں۔

ھر صنف شعر اور ھر وزن محض نظم یا غزل کی ھیئیت کو ترتیب نہیں دیتا بلکہ اس کی اپنی ایک انفرادی حیثیت بھی ھوتی ھے جو نفس مضمون کے ساتھ ھم آھنگ ھوکر اجاگر ھوتی ھے اور خود موضوع سخن کو چمکاتی ھے۔

اصناف سخن میں مثنوی کی صنف کو عام طور پر کسی طویل موضوع کے لئے موزوں سمجھا جاتا ھے اور اس کے لئے سادہ اور چھوٹی بحر انتخاب کی جاتی ھے چنانچہ فارسی میں اسرار و رموز دونوں طویل نظمیں، مثنوی میں ھیں اور ان کی بحر بھی چھوٹی ھے لیکن اقبال کی ایک مختصر نظم ''ایک شام،، اور ''والدۂ مرحومہ کی یاد میں،، جو نسبتاً لمبی ھے مثنوی میں ھے اور ایک کی بحر چھوٹی اور دوسری کی طویل ھے۔ ان کی طویل نظموں میں شکوہ مسدس میں ھے، مسجد قرطبہ ترکیب بند ھے اور ساقی نامہ مثنوی۔ آخر یہ تباین کیوں ھے؟ کیا یہ تباین محض تنوع برائے تنوع کے لئے تھا۔ نہیں۔ ان نظموں کے بنیادی خیال الگ الگ ھیں۔ ھر نظم میں شاعر کا موضوع کی طرف رحجان کا انداز الگ ھے۔ اس کا زاویہ' نگاہ جداگانہ ھے اس کے سامعین مختلف ھیں، یوں کہئے کہ ھر نظم کا مزاج الگ ھے اور شاعر نے اسی مزاج کے مطابق صنف شعر اور پھر اس صنف شعر کے لئے بحر، انتخاب کی ھے۔

''شکوہ،، ایک بچے کی فریاد ھے جو کبھی جائز اور کبھی ناجائز طریق پہ روتا ھے اور ھنگامہ بپا کرتا ھے۔ اس کی چیخ پکر کے تقاضوں میں کوئی منطقی ربط یا جذباتی تسلسل نہیں ھوتا وہ اپنے شور اور غوغا سے محض بڑوں کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرانا اور اپنی بیچارگی کو منوانا چاھتا ھے۔ مسدس کے چھ مصرعی بند، بچے کی فریاد کے بے ربط سے ٹکڑے ھیں جنہیں وہ بغیر کسی التزام کے جوڑتا چلا جاتا ھے۔

اس کے برعکس ان کی نظم ''والدۂ مرحومہ کی یاد میں،، ایک کہن سال، تجربہ کار، جہاں دیدہ، مفکر بزرگ کی دبی ھوئی رکی رکی سی فریاد ھے اس لئے کہ

علم و حکمت رھزن سامان اشک و آہ ھے
یعنی اک الماس کا ٹکڑا دل آگاہ ھے

لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اس نظم میں مرثیے کی سی اثر انگیزی نہیں ۔ یہ ایک بوڑھے انسان کی ہلکی سی آہ ہے جو بچے کی چیخ پکار سے کہیں زیادہ موثر ہوتی ہے ۔ ''والدہ مرحومہ کی یاد،، میں صرف اقبال کی والدہ کی یاد ہی پوشیدہ نہیں بلکہ ہر ذکی الحس انسان کی والدہ کی یاد سموئی ہوئی ہے ۔ بچے کی فریاد سے بچے کی ماں چونک اٹھتی ہے ۔ اس خاموش فریاد سے دنیا کے دل لرز جاتے ہیں ۔ اس نظم کا تاثر ہمہ گیر ہے ۔ اس میں آفاقیت ہے ۔

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا یہ نظم مثنوی میں ہے اور اس کی بحر لمبی ہے مثنوی سے اس نظم کے خیالات میں تسلسل اور روانی ابھرتی ہے اور اس کی لمبی بحر سے باتیں کرنے والے کی ثقاہت طبع کا پتا چلتا ہے ۔

ہمارا نظریہ اقبال کی ایک فارسی نظم سے زیادہ واضح ہوسکے گا ۔ وہ نظم ''تسخیر فطرت،، ہے ۔ اس نظم کو شاعر نے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے ۔ میلاد آدم ۔ انکار ابلیس ۔ اغوائے آدم ۔ اخراج آدم از بہشت ۔ اور صبح قیامت ۔ نظم ایک ہے ۔ خیالات مسلسل اور مربوط ہیں لیکن نظم کے ہر حصے کی ہیئت الگ الگ ہے ۔ پہلے بند کا آغاز یوں ہوتا ہے

نعرہ زد عشق کہ خونین جگرے پیدا شد حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان خاموش خود گرے، خود شکنے، خودنگرے پیدا شد

''میلاد آدم،، ایک ہنگامہ آفرین حادثہ تھا ۔ شاعر اس ہنگامے کا اعلان بڑے طمطراق سے کرتا ہے ۔ اس بند کی بحر، اشعار کا اندرونی ترنم، اس کے قوافی اور ردیف وہی اثر انگیزی پیدا کر رہے ہیں ۔

دوسرے دو بندوں میں ابلیس کا ذکر ہے جو اس ہنگامے کو دیکھتا ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتا ۔ وہ بڑی متانت اور رعونت سے آدم کا خیر مقدم اور اس کی عظمت سے انکار کرتا ہے اور پھر اسے پھسلانے اور بہکانے کے لئے بھی اسی متانت سے سرگرم عمل نظر آتا ہے ۔ دیکھئے یہاں بحر اور بحر کے ساتھ طرز بیان کا لہجہ کیسے بدلتا ہے

نوری نادان نیم سجدہ بآدم برم او بنہاد است خاک من بہ نژاد آذرم
می تپد از سوز من خون رگ کائنات من بدو صرصرم ، من بفوتندرم

چوتھے بند میں آدم کے اس کائنات ارضی کی وسیع، دلکشا فضا میں سانس لینے کا تذکرہ ہے ۔ شاعر نے یہاں نہ صرف بحر کو بدلا ہے بلکہ صنف شعر کو

بھی بدل دیا ہے۔ یہ بند ایک غزل ہے جس کا لہجہ طربیہ ہے۔ لفظوں سے نشاط انگیزی ٹپک رہی ہے۔

چه خوش است زندگی را همه سوز و ساز کردن
دل کوه و دشت و صحرا به می گداز کردن
ز قفس دری کشادن به فضاے گلستانی
ره آسمان نوردن به ستاره ساز کردن

شاعر اس نظم کے آخری بند میں آدم کو خدا کے حضور میں دکھاتا ہے جہاں وہ اپنی انسانی عظمت کو بیان کرتا ہے لیکن نہایت عجز و احترام کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اس کے طرز بیان میں طمطراق نہیں انکسار ہے۔ لجاجت ہے۔ چنانچہ اشعار کا لہجہ بھی اسی کے مطابق بدلتا ہے۔

ہے که ز خورشید تو کوکب من مستنیز
از دلم افروختی شمع جهان ضریر
گرچه فسونش مرا برد ز راه صواب
از غلطم در گذر، عذر گناهم پذیر

اس بند کے اشعار کے اخیر میں قافیہ اور ردیف کی جگہ صرف روی سے کام لیا گیا ہے۔ اس روی کے الفاظ مستنیز، ضریر، پذیر کی آواز عمودی نہیں افقی ہے جو بات کرنے والے کی لجاجت طبع کو ظاہر کرتی ہے۔

اب ہم اقبال کی دو کامیاب اور مشہور نظموں مسجد قرطبہ اور ساقی نامہ کو لیتے ہیں اور ان کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس تجزیے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی کہ اقبال کے یہاں موضوع اور ہیئت میں کس قدر گہرا ربط ہے۔

مسجد قرطبہ کا عنوان وہی حیثیت رکھتا ہے جو اقبال کے کلام میں دوسری نظموں مثلاً "بلال"، کناری راوی، یا موٹر۔ شاعر نے اس نظم میں مسجد قرطبہ کی تاریخ بیان نہیں کی، اس کے فنی اور تعمیری محاسن کا جائزہ نہیں لیا۔ نظم "صقلیہ"، کی طرح اس نے قدیم حجازی تہذیب کے مٹتے ہوئے آثار پر آنسو نہیں بہائے۔ یہ عنوان محض ایک شعری علامت ہے۔ ایک مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد شاعر نے اپنے خیالات کی دنیا تعمیر کی ہے اور اپنے جذبات کی باز آفرینی دکھائی ہے۔ یہ ایک کنایہ ہے جو اس کے شاعرانہ احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔

''مسجد قرطبہ،، کی علامت میں تقدس کا پہلو پوشیدہ ہے۔ وہ فن تعمیر کا ایک شاہکار بھی ہے اور عہد ماضی کی شاندار روایات کی یادگار بھی۔ چنانچہ شاعر نے ان تمام باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے، نظم کے لئے ترکیب بند کی صنف انتخاب کی ہے۔ ایک بند سے دوسرے بند تک پہنچنے کے لئے وہ بڑے سکون اور احترام سے چلتا ہے۔ بحر کی طوالت شاعر کی ذہنی کیفیت کی آہستہ خرامی کو ظاہر کرتی ہے۔

شاعر نے نظم کی ابتدا یوں کی ہے

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات   سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ   جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز شب ساز ازل کی فغاں   جس سے دکھاتی ہے ذات زیروبم ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ،مجھ کو پرکھتا ہے یہ   سلسلۂ روز شب، صیر فی کائنات

یہ بحر مفتعلن فاعلن، مفتعلن فاعلات ہے۔ یہ بحر اگرچہ نئی نہیں تاہم اردو شاعری کے مروجہ ور متداول بحروں سے الگ تھلگ ضرور ہے۔ یہ انتخاب، شاعر کا غیر شعوری عمل نہیں، ارادی اور اختیاری تصرف ہے اس لئے کہ اس بحر کی رفتار موضوع کی ثقاہت اور جذبات کے شدید مگر منضبط اتار چڑھاؤ کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اس بحر کے ارکان میں باہمی توازن ہے۔ اس سے اشعار میں ایک اندرونی ترنم پیدا ہوگیا ہے جو قافیہ اور ردیف کے نہ ہونے کی تلافی کرتا ہے کیونکہ اس نظم کے اشعار میں قافیہ اور ردیف کی جگہ فقط روی کا استعمال ہوا ہے۔

اس نظم میں عربی اور فارسی کے پرشکوہ اور قدرے غیر مانوس الفاظ استعمال کئے گئے ہیں مثلاً صیرفی کائنات۔ کاس الکرام۔ ابن السبیل۔ بادۂ رحیق ثغور۔ تیغ اصیل۔ شبوں کا گداز۔ مگر ان لفظوں کی نشست شعروں میں اس طرح حسین واقع ہوئی ہے جیسے کسی عظیم الشان عمارت میں بڑے بھاری پتھروں کے ٹکڑے لطیف انداز میں جڑے ہوتے ہیں اور اپنی عظمت کے ساتھ ساتھ شاہپارہ فن میں لطافت پیدا کرتے ہیں۔ اس نظم کی اہم خصوصیت اس کا مترنم پن ہے۔ یہ ترنم آمیز لہجہ شروع سے اخیر تک چلا جاتا ہے۔ رستے میں مختلف النوع منزلیں آتی ہیں۔ وقت کی رو۔ بندۂ مومن، نظریۂ فن، اندلس کی فضائے حسیں میں عالم نو کے معرض وجود میں آنے کے امکانات، لیکن ساری نظم، ایک خاموش قافلے کی طرح چلی جاتی ہے جس کے ہر راہی کا قدم ایک ہی نہج پر پڑتا ہے اور ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔

الفاظ کی اجنبیت اور ثقالت اس روانی میں حارج نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ وہ الفاظ معنوی اشارے نہیں بلکہ احساساتی محرکات ہیں جن سے جذبات خود بخود ابھرتے چلے جاتے ہیں۔

چند شعر سنئے :—

شاعر مسجد سے خطاب کرتا ہے

کعبۂ ارباب فن، سطوت دین مبین
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمین
آہ وہ مردان حق، وہ عربی شہسوار
حامل خلق عظیم صاحب صدق و یقین
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمز غریب
سلطنت اہل دل، فقر ہے شاہی نہیں
جن کی نگاہوں نے کی تربیت شرق و غرب
ظلمت یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں
جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوشدل و گرم اختلاط، سادہ و روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دلنشیں

اس نظم کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس مسجد کے ساتھ ساتھ ایک اور مسجد فضا میں تعمیر ہورہی ہے جس کی بنیادیں سنگ و خشت پر نہیں بلکہ انسان کے غیر فانی احساسات پر استوار کی گئی ہیں۔

ساقی نامہ اور مسجد قرطبہ دونوں نظموں کا بنیادی خیال ایک ہے لیکن موضوع الگ الگ ہے۔ ساقی نامہ موضوع کے اعتبار سے مسجد قرطبہ کی ہم سخن ہے، ہمنوا نہیں۔ اس کی لے اور مسجد قرطبہ کی لے میں وہی فرق ہے جو خود ان نظموں کے عنوانوں میں ہے۔ ایک طرف ایک نظم کا موضوع تاریخ، تقدیس اور فنون کا پس منظر پیش کرتا ہے اور دوسری طرف دوسرا موضوع، خرابات اور طرب و انبساط کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ اس نے طرب و انبساط کی فضا میں اپنے متین خیالات کو اس طرح سمویا ہے کہ نظم کے نفس مضمون اور زبان و بیان میں مغائرت نہیں رہتی۔ اس مقصد کے حصول کے لئے شاعر نے بہت سے فنی وسائل استعمال کئے ہیں۔

(۱) ہلکی پھلکی بحر جو بحر متقارب مثمن محذوف و مقصور ہے

(۲) مثنوی کی صنف جس سے اسلوب بیان کی سادگی بدستور قائم رہتی ہے اور کہیں ثقالت پیدا نہیں ہوتی ۔

(۳) روی اور قافیہ ردیف کا بدلتا ہوا امتزاج تا کہ مثنوی کے اشعار کی یکسانیت دور ہوسکے

ہوا خیمہ زن کاروان بہار — ارم بن گیا دامن کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن — شہید ازل، لالہ خو نین کفن
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں — لہو کی ہے گردش رگ سنگ میں

یا

لبھاتا ہے دل کو کلام خطیب — مگر لذت شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا — لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمت حق میں مرد — محبت میں یکتا، حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا — یہ سالک مقامات میں کھو گیا

دیکھئے شاعر نے روی اور ردیف کے متبادل تکرار سے نظم کے اتار چڑھاؤ کو کس طرح قائم رکھا ہے ۔

اس نظم کی سادگی بیان کے ساتھ ساتھ اس میں اختصار و ایجاز بھی ہے چند اشعار سنیئے ۔ ہر شعر ایک نظم معلوم ہوتا ہے : —

جہاں چھپ گیا پردہ رنگ میں — لہو کی ہے گردش رگ سنگ میں
تمدن، تصوف، شریعت، کلام — بتان عجم کے پجاری تمام
گیا دور سرمایہ داری گیا — تماشا دکھا کر مداری گیا
مری فطرت آئینہ روزگار — غزالان افکار کا مرغزار
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے — اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

باوجود اس کے کہ نظم کا مضمون جگہ جگہ پہلو بدلتا چلا جا رہا ہے نظم کی کیفیاتی ہم آہنگی میں کہیں فرق نہیں آتا ۔ اس کے تمام اجزا ایک دوسرے سے اس طرح جذباتی طور پر پیوست ہیں کہ ساری نظم ایک کیفیاتی

تجربہ بن گئی ہے ۔ اس نظم میں شاعر الفاظ کی ترکیبات، تشبیہات و استعارات، تلمیحات اور علامات بھی موضوع کے مطابق لایا ہے :-

کاروان بہار ۔ دامن کوہسار ۔ آشیاں ۔ طیور ۔ ساقی لالہ فام ۔ لذت شوق ۔ گردش جام ۔ خلوت و انجمن ۔ غزالان افکار ۔ مرغزار ۔ انجمن آفرین و خلوت نشین ۔

پھر شاعر نے ھندی الفاظ کو فارسی الفاظ کے ساتھ لا کر ایک حسین لسانی توازن بھی پیدا کیا ہے تاکہ ساقی نامے کی فضا قائم رہے ۔

اقبال کے کلام میں نظموں کے علاوہ، غزلوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے ۔ غزل کا ہر شعر الگ الگ ھوتا ہے ۔ اقبال جیسے فلسفی کے لئے جس کا دل و دماغ ایک منطقی کی طرح سوچتا ہے اور بیان میں تعین اور صراحت چاھتا ہے غزل کی صنف اور اس کا اسلوب بیان موزوں نہ تھا ۔ لیکن اقبال نے اپنی غزلوں میں تغزل یعنی رمز و ایما ۔ علامات و تلمیحات کے استعمال کے ساتھ ساتھ غزل کے اشعار میں جذباتی تسلسل پیدا کرکے اسے نظم کا رنگ دے دیا ۔

اس نے ان علامتوں اور تلمیحوں کی اپنی نئی بصیرتوں کی روشنی میں باز آفرینی کی ہے اور اس باز آفرینی سے شعری روایات کے مفہوم کو بدل دیا ہے ۔ وہ ہر غزل میں بنیادی خیال کے مزاج کے مطابق بحر بھی تلاش کرتا ہے ۔ یہاں صرف دو غزلوں کی مثالوں پر اکتفا کروں گا ۔

پہلی غزل ہے

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ھوگا یہی ہے اک حرف محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ
مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ھیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ھوں دانہ دانہ

اس غزل میں کیفیاتی تسلسل بہت مکمل ہے یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اس غزل کا نظم کی طرح عنوان بھی رکھا ہے ۔ ''زمانہ،، اس غزل کی بحر لمبی ہے جس میں بحر متقارب مثمن مقبوض اثلم کے آٹھ ارکان کو سولہ کرکے لکھا ہے فعول و فعلن، فعول فعلن، فعول فعلن، فعول فعلن ۔ دو مصرعوں کو ایک مصرعہ بنادیا ہے ۔ اس بحر کے استعمال سے شاعر نے وقت کے پھیلاؤ

اس کے تواتر اور تسلسل اور اس طوالت کی کیفیت کا اظہار کیا ہے جو اس بحر کی موسیقیت سے خود بخود آشکار ہو جاتی ہے۔ قافیہ ردیف کی جگہ روی کو استعمال کیا ہے اور اس کی تلافی اندرونی ترنم سے کی ہے۔

دوسری غزل ہے۔

هر شے مسافر، هر چیز راهی — کیا چاند تارے، کیا مرغ و ماهی
تو مرد میداں، تو میر لشکر — نوری حضوری تیرے سپاهی
دنیائے دوں کی کب تک غلامی — یا راهبی کر، یا بادشاهی
پیر حرم کو دیکھا ہے میں نے — کردار بے سوز، گفتار واهی

اس غزل میں شاعر دنیا پر ایک اچکتی ہوئی نظر ڈالتا چلا جا رہا ہے۔ اس کا مشاہدہ تیزی کے ساتھ ہر لمحہ ایک نیا پہلو بدلتا ہے۔ ان مختصر سے مشاہدات کو بیان کرنے کے لئے اس غزل کے لئے چھوٹی بحر استعمال کی ہے۔ تاکہ مشاہدوں کی تیزی نمایاں ہو جائے۔ اور پھر شعروں کے اخیر میں لمبے اور ڈھلکتے ہوئے قافیہ ردیف نہیں لایا تا کہ اس مختلف النوع مشاہدوں کا تواتر نہ ٹوٹ جائے اور ایک کے بعد دوسرا کیفیاتی تجربہ فوراً سامعین کے ذہن نشین ہوسکے۔

غرض اقبال کے کلام میں شعری تصورات، حسین افکار اور حسین اسلوب دونوں کا حسین امتزاج ہیں۔ اس کے نزدیک نظم کی ہیئت فقط بحر اور قافیہ ردیف ہی کا نام نہیں بلکہ اس میں، اندرونی ترنم، اسلوب بیان کا لہجہ، بنیادی خیال سے، اس کی ہم آہنگی سبھی کچھ شامل ہے۔

All rights reserved ©2002-2006